عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۸)

قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں الحق کا استعمال	الحق کا استعمال قرآن حکیم میں حسب ذیل چار طریقوں پر ہوا ہے۔ (۱) اس ذات کے لئے جو اپنی مرضی کے مطابق کسی چیز کی ایجاد کرے ثُمَّ

ردوا الی اللہ مولٰہم الحق ۶/۶۱

(۲) اس شی کے لئے جو حکمت کے مقتضی کے مطابق ایجاد کی گئی ہو ماخلق اللہ ذلک الا بالحق ۱۰/۵

(۳) کسی شی کے متعلق وہ اعتقاد رکھنا جو حقیقت اور نفس الامر کے مطابق ہو فھدی اللہ الذین اٰمنو لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ ۲/۲۱۳

(۴) وہ قول یا فعل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح اس کا ہونا ضروری ہے اور اسی وقت اور اسی مقدار میں ہو جس وقت اور جس مقدار میں اس کا ہونا واجب ہے ولو اتبع الحق اھواءھم ۲۳/۷۱ کان حقاً علینا نُنج المومنین ۱۰/۱۰۳

اگر آپ بغور ملاحظہ فرمائیں تو ہر ایک مقام میں مذکورہ بالا الحق کا مفہوم اُبھرا ہوا دکھائی دیگا۔

اب ہم زیر بحث "الحق" کی تشریح کرتے ہیں۔

زیر بحث الحق کی تشریح	مفسرین نے اس کے جو معنی مراد لئے ہیں وہ یہ ہیں

وتواصوا بالحق ای بالامر الثابت الذی لا یسوغ انکارہ وھو الخیر	الحق وہ حقیقت ثابتہ ہے کہ کسی صورت میں اس کا انکار سہل نہ ہو اس میں ہر قسم کی خیر و فلاح داخل ہے

کلہ من توحید اللہ وطاعتہ واتباع کتبہ ورسلہ[1] — یعنی اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں کی اتباع ۔

قاضی بیضاوی "الحق" کی عمومیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

یعم الاعیان الثابتۃ والافعال الصائبۃ والاقوال الصادقۃ[2] — وہ حقائق جو مسلم ہوں اور وہ افعال جو عقل اور شرع کے نزدیک درست ہوں اور وہ اقوال جن میں صداقت کی روح ہو الحق کا مفہوم ان سب کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے ۔

روح المعانی میں ہے ۔

الحق خلاف الباطل ویطلق علی الاقوال والعقائد والادیان والمذاهب باعتبار شمولہ علی ذلک[3] — "الحق" وہ حقیقت جو باطل کے خلاف ہو اس کا استعمال موقع کی مناسبت سے اقوال، عقائد، ادیان، مذاہب سب کے لئے ہوتا ہے ۔

تفسیر جلالین میں ہے ۔

بالحق ای الایمان ای القرآن اوکل خیر من اعتقاد او عمل او الحق الثابت الذی لا یصح انکارہ[4] — الحق سے ایمان قرآن اعتقاد و عمل کی ہر خیر و فلاح اور حقیقت ثابتہ جس کا انکار کرنا درست نہ ہو سب مراد لئے جا سکتے ہیں ۔

مذکورہ تصریحات سے دو باتیں معلوم ہوئیں

(۱) یہ کہ الحق کا مفہوم عام ہے ۔

(۲) یہ کہ اس کی عمومیت میں عروج و نفاذ کی تمام وہ حقیقتیں اور صداقتیں داخل ہیں جو

---

[1] تفسیر مدارک [2] بیضاوی ص۸۳۵ [3] روح المعانی جلد اول ص ۱۹۱ [4] جلالین وحاشیہ جلالین ص۵۰

ہر دور میں اور ہر قوم میں یکسانیت کے ساتھ پائی جاتی رہی ہیں خواہ ان کا تعلق ایمانیات سے ہو یا عملیات سے، اخلاقیات سے ہو یا مادیات سے۔

معروف اور منکر کی تشریح سے الحق کی وضاحت | اس سلسلہ میں قرآن حکیم کی دو اہم اصطلاحیں معروف اور منکر کی تشریح کر دینا مناسب ہے تاکہ "الحق" کے مفہوم کی مزید وضاحت ہو سکے۔

قرآن حکیم کے اکثر و بیشتر مقام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اور ایک جگہ تو اس کو خیر امت (جس کے پاس قیام و بقاء کی ضمانت ہو) کی زندگی کا نصب العین قرار دیا گیا ہے

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لئے ظہور
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ	میں آئی ہے تم معروف کا حکم دینے والے منکر سے
وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۳ـ۱۱	روکنے والے اور اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو۔

یہاں خیر امت کے تین وصف بیان ہوئے ہیں (۱) امر بالمعروف (۲) نہی عن المنکر (۳) اور ایمان باللہ۔ "اخرجت للناس" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں "خیر امت" کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں اس کے رگ رگ اور نس نس میں رچی بسی ہوئی ہیں، اسی پر اس کا قیام و بقا موقوف ہے اور اسی صورت میں وہ خیر امت کہلانے کی مستحق ہے۔

معروف عرف سے ہے جس کے معنی پہچاننے کے ہیں اور منکر انکار سے ہے اس بنا پر معروف میں تمام وہ باتیں آگئیں جو قیام و بقا کے سلسلہ میں جانی پہچانی ہوئی ہیں یعنی جو تاریخ کی مسلمات میں سے ہیں اور جن پر ہمیشہ قوموں کے عروج کی بنیاد رکھی جاتی رہتی ہے۔ اسی طرح منکر میں تمام وہ باتیں شامل ہیں جو قومی زندگی کے بارے میں مہلک ہیں اور جن پر قانون فطرت کی زبان میں ہمیشہ انکار کیا گیا ہے۔

ابو بکر جصاص نے معروف کی یہ تعریف کی ہے۔

والمعروف هو ما حسن في العقل ولم	معروف وہ ہے جس کی عقلی نقطہ نظر سے تحسین کی گئی
يكن منكرا عند ذوي العقول الصحيحة[1]	ہو اور صحیح عقل رکھنے والوں نے اس پر نکیر نہ کی ہو۔

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۲۷

وَتُؤمِنُوْنَ بِاللّٰہِ کی قید سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عقل کے لئے معیار کا ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ عقل کے فیصلے مختلف ہوتے ہیں اور وہ معیار ایمان باللہ ہے۔

تواصی بالحق میں جذبہ اور اسپرٹ کا مفہوم پایا جاتا ہے | "تواصی بالحق" کے سلسلہ میں ایک اور بات خصوصی توجہ کی مستحق ہے جو اس ترکیب کی جان ہے اور قومی و جماعتی زندگی میں اس کی حیثیت بنیادی کی ہے وہ جذبہ اور اسپرٹ ہے۔

قطع نظر اور باتوں کے "تواصی بالحق" کو عروج و بقا کا اصول قرار دینا خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہاں جو کچھ حکم و احکام ہیں ان سب میں اجتماعی طور پر آگے بڑھنے اور بڑھانے کا جذبہ ملحوظ ہے۔ اسی طرح ایمان کے بعد کسی شے کا ذکر کرنا گویا اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اس کے لئے جس قسم کا جذبہ (اسپرٹ) درکار ہے ایمان کے بغیر وہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

دنیا کی تاریخ کا آپ جس قدر گہری نظر سے مطالعہ کریں گے اسی قدر یہ حقیقت کھلتی جائے گی کہ چھوٹے بڑے انقلاب کا روح رواں یہی جذبہ ہے اسی سے قومی زندگی کا مقام متعین ہوتا ہے اور اسی سے زندگی کو آگے بڑھانے والے عناصر اقدام۔ عزم۔ شجاعت۔ جانبازی وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور جس قدر ایمان میں پختگی ہوتی ہے اسی قدر یہ عناصر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں کیوں کہ جسم کی مضبوطی دراصل دل کی مضبوطی پر موقوف ہے اور دل اسی کا زیادہ مضبوط ہو گا جس کے ایمان میں پختگی زیادہ ہو گی آج کل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فوجیوں کی تربیت میں جس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ "اسپرٹ" اور اندرونی قوی کی مضبوطی ہے۔

رسول اللہ کی بیان کردہ ایک مثال سے جذبہ اور اسپرٹ کی وضاحت | قومی اور جماعتی زندگی میں اس جذبہ کی کیا کیفیت ہونی چاہیئے؟ داعی انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح ایک مثال کے ذریعہ اس طرح کی ہے۔

فرض کرو۔ ایک بحری جہاز ہے جس کے اوپر نیچے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور سب کی ضرورت کا سامان پانی وغیرہ ایک جگہ بالائی حصہ پر رکھا ہوا ہے نچلے حصہ کے لوگ پانی لینے کے واسطے اوپر کے

حصہ میں آتے رہتے ہیں اب اگر اوپر والے بلا تکلف باہمی اشتراک کے جذبہ کے ماتحت پانی دے دیتے ہیں تو سب کا کام اطمینان کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں پیش آتا ہے لیکن اگر وہ لوگ اس بنا پر انھیں پانی نہیں دیتے ہیں کہ ان کے آنے سے معمولی تکلیف ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ پانی حاصل کرنے کے لئے دوسری تدبیریں کرنے پر مجبور ہوں گے۔ چار و ناچار انھوں نے یہ تدبیر سوچی کہ جہاز میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے سمندر سے پانی حاصل کر لیا جائے اور وہ اس میں سوراخ کرنے لگے کیوں کہ پانی کے بغیر زندگی کا قائم رکھنا دشوار تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر اوپر والے انھیں نہ تو سوراخ کرنے سے روکتے ہیں اور نہ ان کے لئے پانی کا بندوبست کرتے ہیں (ایسی حالت میں زبانی روکنے سے کام نہ چلے گا بلکہ پانی کا بندوبست کرنا ضروری ہوگا) تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جہاز میں سوراخ ہو جانے کے بعد اس میں پانی بھر جانے کی وجہ سے وہ ڈوب جائے گا پھر نہ سوراخ کرنے والے بچیں گے اور نہ اس سے چشم پوشی اور غفلت کرنے والے۔[1]

یہ حدیث جماعتی زندگی کی نفسیات اور اس کے مطالبات کو سمجھنے کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے جماعتی زندگی کو سمندر میں جہاز پر سواری کے ساتھ تشبیہ دینا اس کی ضروریات کو پانی جیسی اہم چیز کے ذریعہ بیان کرنا تکلیف کے باوجود تعاون اور اشتراک کے جذبہ کو نظر انداز نہ کرنا اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں جہاز میں سوراخ ہونا اگرچہ یہ سوراخ صحیح مقصد کے ماتحت کیا گیا ہو اور اس کے نتیجہ میں جہاز کا ڈوب جانا یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جن میں غور و فکر کئے بغیر گذر جانا فرمانِ رسولؐ کی ناقدر شناسی ہے۔

ایک اور مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت

ایک اور مثال کے ذریعہ مذکورہ جذبہ اور اسپرٹ کو اس طرح سمجھئے۔ دیہاتوں میں جہاں "فائر بریگیڈ" کا انتظام نہیں ہوتا ہے وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب محلہ میں کسی کے گھر آگ لگ جاتی ہے تو اس کے بجھانے کے لئے اہلِ محلہ کس طرح ٹوٹ پڑتے

---

[1] حدیث کے آخری ٹکڑے یہ ہیں فان اخذ وا علی یدیہ انجوہ ونجوا انفسھم وان ترکوہ اھلکوہ واھلکوا انفسھم (مشکوٰۃ)

میں کوئی پانی لئے دوڑ رہا ہے کوئی کنوئیں سے پانی نکال رہا ہے کوئی اُس سامان کو نکال نکال کر باہر کر رہا ہے جس میں آگ جلد پکڑتی ہے غرض عورتیں بچے مرد سب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق بچاؤ کا سامان کرنے اور آگ بجھانے کی کوشش میں سرگرمِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ جو جس حالت میں ہوتا ہے وہ خبر پاتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور جتنی کوشش اور امداد کی سکت رکھتا ہے اس سے دریغ نہیں کرتا ہے۔ اپنے پرائے دوست دشمن کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے ذاتی رنجشیں اور دلی کدورتیں کافور ہو جاتی ہیں بس ان کے سامنے ایک مقصد (آگ بجھانا) ہوتا ہے جس کی خاطر بھاگ دوڑ کرتے ہیں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں جلتے ہوئے مکان سے سامان نکال کر باہر کرتے ہیں کبھی اپنے گھر والوں سے کھچتے ہیں اور کبھی دوسروں سے کبھی سست رو کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں اور کبھی دو ایک تھپڑ رسید کر کے کام پر لگاتے ہیں غرض اس طرح ایک خاص جذبہ کے ماتحت حتی المقدور سب مصروف رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو مصروف رکھتے ہیں اور یہ خطرہ ان کے سامنے رہتا ہے کہ اگر معمولی سی غفلت برتی گئی تو پل بھر میں آگ کے شعلے پورے محلہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر زندگی اور احترام نفس کے اُس فلسفہ پر غور فرمائیے جو قرآن حکیم کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اور جس نے پوری انسانیت کو ایک وحدت قرار دیا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۵/۳۲

جس نے سوائے اس حالت کے کہ کسی سے قصاص لینا ہو یا ملک میں فتنہ و فساد پھیلانے والوں کو سزا دینی ہو کسی جان کو مار ڈالا تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا اور جس نے کسی کی جان بچا لی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی

"فکانما قتل الناس جمیعا" اور "فکانما احیا الناس جمیعا" یہ دونوں ٹکڑے بناؤ اور بگاڑ کے کس قدر دوررس نتائج کی نشان دہی کر رہے ہیں؟ اور احترام نفس کا کتنا

اونچا فلسفہ پیش کرتے ہیں ؟ ظاہر ہے جس کتاب نے فرد کے بناؤ اور بگاڑ کو اتنی اہمیت دی ہو اس کے مطابق تیار کیے ہوئے افراد کی جماعت میں باہمی تعاون و اشتراک اور دوسروں کے بقار کی خاطر خود کو فنا کر دینے کا جذبہ (اسپرٹ) کس قدر ہوگا۔

اب ہم ان جذبات کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو قومی زندگی میں موثر ہوتے ہیں اور قیام و بقار کی ضمانت پیش کرتے ہیں۔

قومیت، وطنیت اور مذہبیت میں سب سے زیادہ موثر جذبۂ مذہبیت ہے | فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع کے ماہرین کے نزدیک ایسے جذبات کی تین قسمیں ہیں (۱) جذبۂ قومیت (۲) جذبۂ وطنیت (۳) اور جذبۂ مذہبیت [۱]

لیکن دنیا کے انقلابات میں گہری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سب سے زیادہ موثر جذبہ مذہبیت ہے کیوں کہ وہ تین بنیادی اصول جن سے قوموں میں روح پیدا ہوتی ہے اس جذبہ میں زیادہ عمدگی کے ساتھ پائے جاتے ہیں جس کی بنار پر جماعتی تعلقات زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں۔

وہ تینوں یہ ہیں (۱) عقاید کی عمومیت (۲) فوائد کی عمومیت (۳) احساس کی عمومیت،

حقیقت یہ ہے کہ جب مذہب دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کی راہ میں بڑی سے بڑی رکاوٹ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی اُس کی مثال اس دریا جیسی سمجھنا چاہئے کہ جس کا پانی طغیانی کی حالت میں پُل کے اوپر سے گذر کر کھیتوں میں پہنچتا ہے اور درمیان کی ہر رکاوٹ کو بہالے جاتا ہے۔

فلسفۂ تاریخ کا یہ مسلمہ فیصلہ ہے کہ دنیا میں بڑی بڑی سلطنتوں کے قیام اور تاریخی انقلاب کے پس پشت ہمیشہ مذہبی جذبہ کارفرما رہا ہے۔ اس سلسلہ میں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کی تاریخ خود مذکورہ بالا حقیقت کی شہادت دیتی ہے چنانچہ جن لوگوں نے اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ

لوتھر کی مذہبی و اصلاحی تحریک کا اثر اس قدر ہمہ گیر ثابت ہوا ہے کہ اس کے بعد کی ہر تحریک

[۱] فلسفۂ جذبات ص۱۱۲ اور روح الاجتماع

میں مذہبی جذبہ کارفرما رہا ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی فلسفیانہ ہو یا ادبی۔

ڈلتھائی کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جرمنی، انگلستان اور فرانس وغیرہ کی علمی و فلسفیانہ تحریکات وغیرہ کے نشو و نما میں مذہب ہی کارفرما تھا اور مغرب کی جدید روح ایک وسیع مذہبی تصور کا نتیجہ ہے حتیٰ کہ عہدِ جدید کی تمدنی اصطلاحات - آزادی - انفرادیت - انسانیت وغیرہ سب مذہبی روح کی تخلیق ہیں اور نظریۂ ارتقا جس کی تفصیل اوپر گذر چکی اور جس نے مروجہ مذہب عیسوی کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں اس کے بارے میں بھی بعضوں کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد مذہبی تصور پر قائم ہے کیوں کہ اس میں ارتقا ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہے اور سب سے اعلیٰ خدا ہے لہ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔ البتہ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ قیام و بقا کے سلسلہ میں فلسفۂ تاریخ نے مذہب کو کیا حیثیت دی ہے اور یورپ کے عہدِ جدید کی تعمیر میں مذہب کا اثر کس قدر ہمہ گیر ثابت ہوا ہے کہ جس کی بنا پر نظریۂ ارتقا عہ تک کو بعضوں نے مذہبی رنگ میں دیکھا ہے۔

مذہب کے اسی عالمگیر اثر کو دیکھ کر یورپ کے اکثر مصنفوں نے لکھا ہے کہ مذہبی جبلت انسان کی اساسی صفتوں میں داخل ہے اور "ایناں" نے کہا ہے کہ مذہبی جبلت انسان میں ایسی

عہ نظریۂ ارتقا اب زیادہ جاندار نہیں باقی رہ گیا ہے پھر بھی اس میں مذہبی تصور مان لینے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب انسان ابتدائی حالت میں حیوان تھا تو کیا اس وقت بھی اس میں مذہبی جذبہ موجود تھا اس کا جواب ماہرینِ نفسیات نے یہ دیا ہے کہ دراصل مذہبی جذبہ کا تعلق کسی ایک جذبہ کے ساتھ مشروط نہیں ہے بلکہ یہ چند جبلتوں کے باہمی امتزاج اور عمل کا نہایت پیچیدہ اور عجیب و غریب نتیجہ ہے ان چند جبلتوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مذہبی نوعیت کی ہوں کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دو یا چند چیزیں جب الگ الگ رہتی ہیں تو ان کے خواص و اثرات مختلف ہوتے ہیں اور جب مل جاتی ہیں تو ان کے خواص و اثرات میں یکسر تبدیلی ہو جاتی ہے اسی طرح دو متضاد وصف کے باہمی اشتراک و امتزاج سے ایک تیسرا وصف پیدا ہو جاتا ہے جو ان کی انفرادی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے ایسے ہی مذکورہ جبلتیں اگرچہ مذہبی نوعیت کی نہ تھیں لیکن بتدریج ترقی کرنے کے نتیجہ میں تاثیر و تاثر کا جو عمل ان میں ہوا اس کے نتیجہ میں مذہبی جذبہ نمودار ہو کر انسان کی جبلت میں داخل ہو گیا نظریۂ اضداد پر ایمان لانے والے اس حقیقت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

لہ ملاحظہ ہو مقدمہ لیستالوزی کا فلسفۂ تمدن و تعلیم۔

ہی فطری ہے جیسے چڑیوں میں گھونسلا بنانا انڈے سے ۔ کانٹ ۔ پستانوزی وغیرہ فلسفیوں کو یقین ہے کہ نفسِ انسانی کا جوہر مذہبی احساس ہے اور تمدنی زندگی کے لئے مذہب بمنزلہ روح کے ہے[2]

یہاں یہ بات ذکر کردینا ضروری ہے کہ فلسفۂ اجتماع کے ماہرین کے نزدیک مذہبی حیثیت صرف اسی مجموعۂ عقاید کو نہیں دی جاتی جو کسی معبود کی عبادت اور پرستش پر مبنی ہو بلکہ کبھی حیرت انگیز نظریہ اور وہ خیال جو عوام کی توجہ کو اپنی جانب کرلے معبود کی قائم مقامی حاصل کرکے مذہب[عـ] کا پارٹ ادا کرتا ہے بشرطیکہ عوام کو اس میں کوئی مخفی طاقت یا عام سطح سے کوئی اونچی چیز نظر آئے[3]

بہرحال دنیا کا مزاج ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ کسی تحریک کو جب تک مذہب جیسی حیثیت نہ دے دی جائے نہ دنیا ٹھیک ٹھیک اس کو قبول کرتی ہے اور نہ اس کے لئے زیادہ ایثار و قربانی کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔

عـ جدید دور کی کمیونزم تحریک اسی قبیل سے ہے اس تحریک سے پہلے جن لوگوں نے معاشی مساوات کا خیال ظاہر کیا اور اُسے مستقل تحریک کی حیثیت دینے کی کوشش کی ان میں سین سمو۔ فوری اے۔ ادبرٹ اوین۔ لوئی بلان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں لیکن ان کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عوام اور مزدوروں سے براہِ راست اپیل کرنے کے بجائے اپنا سارا زور سرمایہ داروں کی اخلاقی حس بیدار کرنے میں لگا دیا جس کی بنا پر یہ تحریک عوامی زندگی کا مذہب نہ بن سکی اور ناکام ہوگئی۔

اس کے برخلاف کمیونزم کے خداوندوں نے سرمایہ داروں کو منہ لگانے کے قابل بھی نہ سمجھا اور سارا زور عوام و مزدوروں کی تنظیم پر خرچ کیا اس بنا پر یہ لوگ ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ جن لوگوں کے سامنے انیسویں صدی کے بدترین حالات اور طبقاتی کشمکش کا نقشہ ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ردعمل کے طور پر یہ تحریک غنیمت ہے اگر یہ نہ ہوتی تو اس سے کہیں زیادہ خطرناک تحریک "زراج یا فوضویت" کے ظاہر ہونے کا قوی اندیشہ تھا جو چھٹی صدی عیسوی کی مزدک ایرانی تحریک کا چربہ ہوتی اور جس کا شعار عام اباحیت اور اقوال و افعال میں کامل آزادی تھا۔ [1] معاشرتی نفسیات ص۵۸ [2] پستانوزی کا فلسفہ ص۱۸۵ [3] روح الاجتماع ص۱۱۹

ادبیات

توکل ـــ!

از

(جناب کاشف راجپوری)

دامِ تنویرِ خرد سے زندگی رسوا نہ ہو
زندگی منت پذیرِ کاہشِ فردا نہ ہو

عالمِ اسباب سے اونچی ہو پروازِ جنوں
زندگی کو گردشِ ایام سے شکوا نہ ہو

عرصۂ امکاں میں شبدیزِ عمل ہو گرم رو
پر ارادت مندِ امکاں دیدۂ بینا نہ ہو

تیرے ہاتھوں میں عنانِ الفس و آفاق ہو
مصلحت کیشِ جہاں چشمِ خرد افزا نہ ہو

سینۂ امکاں پہ اک جوئے رواں ہے زندگی
دیدۂ بیدارِ مومن پر عیاں ہے زندگی

دیکھ میری آنکھ سے اے آرزومندِ حیات
تجھ کو دھوکا دے گئے نقش و نگارِ کائنات

تجھ کو سمجھاتی رہی تیرے ارادوں کی شکست
تیرے ہاتھوں میں ہے یہ نظم و کمالِ شش جہات

آخرِ شب تو نے دیکھا ظلمتِ شب کا مآل
یوں ہی مٹ جاتی ہے اک دن گرمیٔ کارِ حیات

قافلہ صحرا میں ہو جیسے کوئی خیمہ گزیں
آہ کتنی مختصر ہے زندگی کی واردات

تیری عنوانِ ترقی کو مٹانے کے لئے
آہ یہ غوغائے شاہی آہ یہ لات و منات

تو نے یہ کس کو بنایا ہے مرادوں کا خدا
وہ نگاہِ شعلہ پرور دشمنِ ذات و صفات

پستیوں کی سمت لے جاتی ہے امیدِ عروج
یہ مآلِ ارتقا ہے یہ کمالِ ممکنات

چھپ نہیں سکتا چھپانے سے یہ حالِ اضطراب
فاش ہو کر رہ گئی شانِ ثباتِ ناثبات

تیرے دوشِ فکر پر بارِ گراں ہے زندگی۔
کیا خبر ہے آبروئے دو جہاں ہے زندگی

آبرو دریا کی جس سے ہے وہ اک طوفاں ہے تو
جانبِ باطل جسے کھینچا ہے وہ پیکاں ہے تو

از زمیں تا آسماں جو کچھ بھی ہے تیرے لئے
آتشِ آفاق پر ابرِ گہر افشاں ہے تو